ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1901

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :مقاصدِ شریعہ • (1901) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ 6 تا(9

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ یہاں پیش کیا گیا مواد نمونہ جواب ہے؛ اسے ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں، اور جہاں کسی شرعی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم و مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر :1 شریعت میں" حاکم "کا مفہوم، عقل کی مقامیت اور حسن و قبح کے تین مکاتبِ فکر 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ شریعتِ اسلامیہ میں" حاکم "کا مفہوم کیا ہے؟ عقل کی مقامیت اور افعال میں حسن و قبح کے اعتبار سے تین مکاتبِ فکر) مسالک ثلاثہ (کی تفصیل بیان کریں۔(20)

تعارف

اصولِ فقہ کے بنیادی مباحث میں سے ایک اہم بحث یہ ہے کہ احکام کا اصل سرچشمہ کون ہے، یعنی" حاکم "کون ہے، اور عقل کا اس نظام میں کیا مقام ہے۔ اسی بحث سے ایک مشہور مسئلہ جڑا ہوا ہے جسے" حسن و قبح "کہا جاتا ہے :

کیا افعال اپنی ذات میں اچھے یا برے ہوتے ہیں جنہیں عقل پہچان سکتی ہے، یا اچھائی برائی کا تعین صرف شریعت کے حکم سے ہوتا ہے؟ اس مسئلے پر اسلامی فکر کی تاریخ میں تین بڑے مکاتبِ فکر سامنے آئے جنہیں مسالک ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ اس سوال کے دو حصے ہیں :پہلے حصے میں حاکم کا مفہوم بیان ہوگا، اور دوسرے حصے میں عقل کی مقامیت کے پس منظر میں تینوں مکاتب کی تفصیل، ان کے دلائل اور ان کے عملی نتائج پیش کیے جائیں گے۔ یہ بحث خالص علمی ہے مگر اس کے اثرات بڑے عملی ہیں، کیونکہ یہیں سے طے ہوتا ہے کہ شریعت کے آنے سے پہلے انسان کی ذمہ داری کیا تھی، عقل اور وحی کا باہمی تعلق کیا ہے، اور جدید مسائل میں اجتہاد کا دائرہ کہاں تک ہے۔

"حاکم "کا مفہوم

اصولِ فقہ میں حاکم سے مراد وہ ذات ہے جس کا خطاب و حکم احکام کا ماخذ ہو، یعنی جس کے حکم سے کوئی فعل واجب، حرام، مندوب، مکروہ یا مباح قرار پائے۔ جمہور علماء کے نزدیک حقیقی حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ اسی کا ارشاد ہے کہ حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور قرآنی تعلیم کے مطابق شریعت سازی کا اختیار اسی خالق و مالک کو ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے قانون نازل کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ و مبین ہیں، یعنی احکام کو پہنچانے اور ان کی تشریح کرنے والے؛ فقہاء و مجتہدین کاشف ہیں، یعنی نص سے حکم کو اخذ و ظاہر کرنے والے، حاکم نہیں۔ یہ فرق بڑا اہم ہے :مجتہد اپنے اجتہاد سے حلال و حرام" بناتا "نہیں بلکہ اللہ کے حکم کو دلائل سے" دریافت "کرتا ہے۔ اسی لیے اجتہاد میں خطا کا امکان رہتا ہے اور ایک مجتہد کا فتویٰ دوسرے کے لیے حجت ہونے کے باوجود قطعی شریعت کے برابر نہیں ہوتا۔ گورنر، قاضی یا پارلیمنٹ جیسے ادارے انتظامی قوانین بناسکتے ہیں جو شریعت کے اصولوں کے تابع رہیں، لیکن حلال و حرام کے بنیادی فیصلے کا اختیار انہیں حاصل نہیں۔ حاکمیتِ اعلیٰ کا یہ تصور قانون کی حکمرانی کی بنیاد ہے، کیونکہ جب حاکم اللہ ہے تو حکمران بھی اس قانون کا پابند ہے۔

حسن و قبح کا مسئلہ اور عقل کی مقامیت

حسن کے معنی اچھائی و خوبی اور قبح کے معنی برائی و خرابی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ برا" کیوں " ہے؟ کیا یہ اچھائی برائی فعل کی ذات میں موجود ہے جسے عقل جان لیتی ہے، اور شریعت اسی کی خبر دیتی ہے، یا یہ صرف اس لیے اچھا برا ہے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا یا اس سے روک دیا؟ عقل کی مقامیت سے یہی سوال مراد ہے :قانون

سازی و اخلاقی فیصلے میں عقل کا درجہ کیا ہے؟ کیا وہ مستقل دلیل ہے، وحی کی خادم ہے، یا اس کا کام محض اطاعت و فہم ہے؟ اس مسئلے پر بحث کا ایک پس منظر یہ بھی ہے کہ جن لوگوں تک شریعت کی دعوت نہ پہنچی ہو، کیا وہ عقل کی بنیاد پر ذمہ دار اور قابلِ مواخذہ ہیں یا نہیں؟ ذیل میں تینوں مکاتب کی تفصیل اسی ترتیب سے پیش کی جاتی ہے تاکہ طالب علم ہر موقف کو اس کے اپنے دلائل کے ساتھ سمجھے اور کسی مکتب کو غلط صورت میں پیش کرنے سے بچے۔

جدول :حسن و قبح کے بارے میں تین مکاتبِ فکر کا موازنہ

مکتبِ فکر	حسن و قبح کی نوعیت	عقل کا کردار
معتزلہ	عقلی؛ افعال ذاتاً اچھے یا برے ہیں	عقل مستقل طور پر خوبی و خرابی پہچانتی ہے
اشاعرہ	شرعی؛ حکمِ الٰہی سے متعین ہوتے ہیں	عقل حکم کو سمجھتی اور اس کی پیروی کرتی ہے
ماتریدیہ / حنفیہ	جزوی طور پر عقلی، تکمیل شریعت سے	عقل بعض خوبیوں کو پہچانتی ہے، ثواب و عقاب شریعت پر موقوف ہے

پہلا مسلک :معتزلہ — حسن و قبح عقلی ہیں

معتزلہ کے نزدیک افعال اپنی ذات میں حسن یا قبیح ہوتے ہیں اور عقل شریعت کے آنے سے پہلے بھی ان کی اچھائی برائی کو پہچان سکتی ہے۔ سچ، عدل اور احسان خود اچھے ہیں اور جھوٹ، ظلم اور ناحق قتل خود برے ہیں؛ شریعت ان کا حکم اس لیے دیتی ہے کہ وہ اچھے ہیں، نہ یہ کہ حکم ملنے سے وہ اچھے ہوگئے۔ اس موقف سے معتزلہ دو بڑے نتائج نکالتے ہیں : اول، اللہ تعالیٰ پر بھی عدل لازم ہے، اس معنی میں کہ وہ ظلم و عبث نہیں کرتا، کیونکہ ظلم اپنی ذات میں قبیح ہے؛ دوم، وہ لوگ بھی مواخذے کے مستحق ہیں جن تک دعوت نہ پہنچی ہو، کیونکہ وہ عقل سے خدا کی معرفت اور بنیادی اچھائی برائی جان سکتے تھے۔ ان کے دلائل میں وہ فطری انسانی تجربہ بھی شامل ہے کہ تمام قومیں، خواہ ان کے مذاہب

جدا ہوں، سچ اور وفاداری کو پسند اور دھوکے اور ظلم کو ناپسند کرتی ہیں، اور یہ اتفاق عقل کی مشترکہ پہچان کی دلیل ہے۔ اس مکتب کی کمزوری جس کی طرف مخالفین اشارہ کرتے ہیں یہ ہے کہ عقل خود قوموں اور افراد میں مختلف فیصلے دیتی ہے، اور کئی عبادات کی تفصیلات عقل سے معلوم ہی نہیں ہوسکتیں۔

دوسرا مسلک :اشاعرہ — حسن و قبح شرعی ہیں

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے مکتب کے نزدیک حسن و قبح شرعی ہیں، یعنی کوئی فعل اسی وقت شرعاً اچھا ہوتا ہے جب شارع نے اس کا حکم دیا ہو یا اس کی تعریف کی ہو، اور برا اس وقت ہوتا ہے جب شارع نے اس سے روکا ہو یا اس کی مذمت کی ہو۔ عقل دنیوی نفع و نقصان، مناسب و نامناسب کو جان سکتی ہے، لیکن ثواب و عقاب اور آخرت کی ذمہ داری کا فیصلہ صرف وحی کرتی ہے۔ اس موقف کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ مالکِ مطلق ہے؛ ملکیت میں تصرف ظلم نہیں ہوتا، اور ظلم کی تعریف ہی یہ ہے کہ دوسرے کی ملک میں بغیر حق تصرف کیا جائے، جو اللہ کے حق میں ممکن نہیں۔ اشاعرہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر عقل مستقل حاکم ہوتی تو رسولوں کی ضرورت باقی نہ رہتی، جب کہ قرآن رسول بھیجے بغیر عذاب نہ دینے کی تصریح کرتا ہے۔ نماز کی رکعتیں، روزے کا مہینہ اور حج کے ارکان جیسی عبادات اس موقف کی روشن مثالیں ہیں جن کی تفصیل و حکمت عقلِ محض سے معلوم نہیں ہوسکتی، صرف شریعت بتاتی ہے۔ یہ مکتب اللہ کی حاکمیت و اختیار کو مرکز میں رکھتا ہے اور عقل کو وحی کا تابع و خادم قرار دیتا ہے۔

تیسرا مسلک :ماتریدیہ و حنفیہ — درمیانی موقف

تیسرا مسلک امام ابو منصور ماتریدی اور حنفی اصولین کا ہے جو دونوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے نزدیک بعض افعال کی خوبی و خرابی کو عقل فی الجملہ پہچان سکتی ہے :عدل، صدق، شکرِ منعم اور علم کی قدر جیسے امور کی اچھائی اور ظلم و جھوٹ جیسی چیزوں کی برائی عقل سمجھ سکتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعثت سے پہلے بھی انسان، کم از کم خالق کی معرفت اور شکر کے باب میں، کسی قدر ذمہ دار سمجھا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ماتریدیہ یہ واضح کرتے ہیں کہ افعال کی تفصیلی احکام، عبادات کی صورتیں اور اخروی ثواب و عقاب کا قطعی تعین شریعت ہی سے ہوتا ہے؛ عقل کی پہچان اجمالی و ناقص ہے اور وحی اس کی تکمیل و تصحیح کرتی ہے۔ یوں یہ مسلک نہ عقل کو بالکل معطل کرتا ہے نہ اسے وحی کے مقابل لاکھڑا کرتا ہے، بلکہ اسے وحی کی روشنی میں چلنے والی قوت قرار دیتا ہے۔ فقہِ حنفی کے کئی اجتہادی

اصول، مثلاً استحسان و مصالح کی رعایت، اسی درمیانی مقامیت کی عملی صورتیں کہی جاسکتی ہیں۔ اس مکتب نے اسلامی فکر میں توازن قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تینوں مسالک کے دلائل، نتائج اور نتیجہ

تینوں مکاتب کے درمیان اختلاف کے اثرات کئی مسائل پر پڑتے ہیں۔ پہلا اثر دعوت نہ پہنچنے والوں کے حکم پر ہے :معتزلہ انہیں عقلی ذمہ داری کی بنیاد پر مواخذے کا مستحق کہتے ہیں، اشاعرہ آیتِ" وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً "کی بنیاد پر وحی کی آمد کو شرط قرار دیتے ہیں، اور ماتریدیہ معرفت و شکر کی حد تک درمیانی رائے رکھتے ہیں۔ دوسرا اثر اجتہاد کے دائرے پر ہے :جہاں نص خاموش ہو وہاں عقلی مصلحت کو کتنا وزن دیا جائے، اس کا جواب ہر مکتب اپنے اصول سے دیتا ہے۔ تیسرا اثر اخلاقیات کی بنیاد پر ہے کہ اخلاقی قدریں وحی کی پابند دریافت ہیں یا انسانی فطرت کی مستقل حقیقت بھی۔ ان اختلافات کے باوجود تینوں مکاتب اس پر متفق ہیں کہ عملی احکام کا حتمی ماخذ وحی ہے اور کسی بھی مکتب نے عقل کو شریعت کے مقابل مستقل قانون ساز نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہے کہ شریعت میں حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے، رسول اس کے مبلغ ہیں اور علماء کاشف و مفسر۔ عقل کی مقامیت کے بارے میں تین مسالک ہیں :معتزلہ کے ہاں عقل مستقل شناسا ہے، اشاعرہ کے ہاں تابع و مبلغ کی فہم رکھنے والی ہے، اور ماتریدیہ و حنفیہ کے ہاں اجمالی شناسائی رکھنے والی مگر وحی کی تکمیل کی محتاج ہے۔ طالب علم کے لیے ادب یہی ہے کہ ہر مسلک کو اس کے دلائل کے ساتھ بیان کرے اور اختلافی مباحث میں قطعی فتویٰ سازی سے گریز کرے۔

سوال نمبر :2 شریعت میں سزا کے نفاذ کا حق، اس کی حدود و شرائط 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ شریعت میں سزا کے نفاذ کا حق کن افراد یا اداروں کو حاصل ہے؟ اس حق کی حدود و شرائط پر ایک جامع نوٹ پیش کریں۔(20)

تعارف

عدل و انصاف کسی بھی مہذب معاشرے کی بنیاد ہے اور سزا اس نظام کا ایک حساس جز ہے۔ شریعت نے جرائم کے لیے سزائیں مقرر کرتے ہوئے یہ بھی پوری صراحت سے طے کیا ہے کہ سزا دینے کا حق کسے حاصل ہے، تاکہ سزا خود ظلم و

فساد کا ذریعہ نہ بن جائے۔ یہ سوال اسی اہم اصول سے متعلق ہے۔ اس جواب میں پہلے سزاؤں کی فقہی اقسام کا مختصر تعارف پیش ہوگا، پھر نفاذ کے حق دار افراد و اداروں کی تفصیل بیان ہوگی، اور اس کے بعد اس حق کی حدود و شرائط —ثبوت کی سخت شرائط، شبہ کی موجودگی میں رعایت، عدالت کی کارروائی، تناسب، عدمِ تشددِ زائد اور ذاتی انتقام کی ممانعت — پر جامع روشنی ڈالی جائے گی۔ اس بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں سزا کسی فرد کی ذاتی صوابدید نہیں بلکہ ایک منظم عدالتی عمل ہے جس میں مجرم کے حقوق بھی محفوظ ہیں، اور آج کے دور میں یہ اختیار ریاست کے باقاعدہ عدالتی نظام ہی کے پاس ہے۔

سزاؤں کی اقسام کا اجمالی تعارف

فقہاء نے سزاؤں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی قسم حدود ہیں: وہ متعین سزائیں جن کی مقدار شریعت نے خود مقرر کردی ہے، مثلاً چوری، زنا، قذف اور شراب نوشی کی سزائیں؛ ان میں کمی بیشی کا اختیار کسی کو نہیں۔ دوسری قسم قصاص و دیت ہے: قتل و زخم کے بدلے کا نظام، جس میں مقتول کے اولیا کو معافی یا دیت کا اختیار بھی حاصل ہے، مگر اس کا نفاذ بھی عدالت ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ تیسری قسم تعزیرات ہیں: وہ سزائیں جن کی مقدار مقرر نہیں بلکہ جرم، حالات اور مصلحت کے مطابق قاضی یا قانون ساز ادارہ متعین کرتا ہے۔ اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزاؤں کا نظام ایک درجہ بند نظام ہے جس میں کوئی درجہ بھی ذاتی عمل دخل سے نہیں چلتا۔ ایک چوتھی اہم بات یہ ہے کہ شریعت کا بڑا زور سزا سے پہلے روک تھام پر ہے: سدِ ذرائع، اخلاقی تربیت، معاشی انصاف اور حدود کے نفاذ میں سخت ثبوتی شرائط اسی حکمت کے مظاہر ہیں۔

نفاذ کا حق: امام، قاضی اور ریاستی ادارے

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کا حق امامِ وقت، یعنی باقاعدہ حکومت و ریاست، اور اس کے مقرر کردہ قاضی و عدالتی نظام کو حاصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سربراہِ ریاست سزاؤں کے فیصلے فرمائے، قاضی بھیجے اور اپنے بعد اس نظم کو امت کے حکمرانوں و عدالتوں کے سپرد کیا۔ اس کی وجہ واضح ہے: سزا کے نفاذ کے لیے ثبوت کی جانچ، گواہوں کی عدالت، ملزم کی سماعت، جرم کی نوعیت کا تعین اور نفاذ کی نگرانی درکار ہوتی ہے، اور یہ سب منظم ادارے ہی کے بس کی بات ہے۔ کوئی فرد، خاندان، قبیلہ یا گروہ خود فیصلہ کرکے کسی کو سزا دے

تو وہ فیصلہ" عدل "نہیں بلکہ فساد و قانون شکنی کہلائے گا، اور اسلام میں ایسے ذاتی انتقام کی سخت ممانعت ہے۔ قصاص میں بھی اگرچہ حق مقتول کے ولی کا ہے، لیکن خون بہانے کا عمل عدالت و حکومت کے سوا کوئی نہیں کرسکتا؛ ولی یا تو معاف کرسکتا ہے یا دیت لے سکتا ہے یا عدالت سے قصاص کا نفاذ چاہ سکتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس اصول کا عملی ترجمہ یہی ہے کہ جرائم کی تحقیق پولیس و تحقیقاتی ادارے کریں، فیصلہ عدالتیں کریں اور نفاذ مقررہ قانونی طریقے سے ہو۔

شرائط :ثبوت، اہلیت اور عدالتی کارروائی

سزا کے نفاذ کی پہلی شرط جرم کا یقینی ثبوت ہے۔ حدود میں ثبوت کا معیار غیر معمولی حد تک سخت رکھا گیا ہے :زنا جیسے جرم میں چار عادل گواہوں کی شرط، چوری میں نصاب، ملکیت، حرز یعنی محفوظ جگہ سے چوری اور مالک کے مطالبے کی شرائط اس کی مثالیں ہیں۔ دوسری شرط مجرم کی اہلیت ہے :وہ عاقل، بالغ اور مختار ہو؛ بچہ، مجنون اور مجبور پر حد جاری نہیں ہوتی۔ تیسری شرط عدالتی کارروائی ہے :الزام، سماعت، صفائی، کا موقع اور قاضی کا فیصلہ؛ بغیر فیصلے کے کوئی عمل سزا نہیں کہلائے گا۔ چوتھی اور مشہور شرط شبہ کا فقدان ہے۔ امت کے علماء نے اس حدیث کو اصول کا درجہ دیا ہے کہ حدود کو شبہات سے ٹال دو؛ یعنی جہاں ذرا سا معقول شبہ موجود ہو وہاں حد ساقط ہوجاتی ہے اور اگر کوئی سزا ہو بھی تو وہ تعزیری دائرے میں آتی ہے۔ یہ شرائط بتاتی ہیں کہ شریعت میں سزا کا دروازہ تنگ اور معافی و رعایت کا دروازہ وسیع رکھا گیا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ بے گناہ کسی صورت سزا نہ پائے، چاہے شک کا فائدہ ملزم کو دینا پڑے۔

حدود :تناسب، مساوات اور نفاذ کے آداب

نفاذ کے حق کی حدود میں اولین بات تناسب ہے :سزا جرم کی نوعیت و سنگینی کے مطابق ہو، اس سے بڑھانا ظلم ہے۔ تعزیر میں قاضی پر لازم ہے کہ مجرم کی حالت، جرم کی کیفیت اور معاشرتی مصلحت کو دیکھے، اور ایسی سزا نہ دے جو اصلاح کے بجائے تباہی لائے۔ دوسری حد مساوات ہے :قانون کے سامنے امیر و غریب، طاقتور و کمزور برابر ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخزومی عورت کے واقعے میں فرمایا تھا کہ اگر میری بیٹی بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا؛ یہ اعلان قانون کی غیر جانبداری کی ابدی مثال ہے۔ تیسری حد یہ ہے کہ نفاذ میں بے جا تشدد، تماشا اور ذلت

آمیز رویہ اختیار نہ کیا جائے، اور جہاں شرعی طور پر گنجائش ہو وہاں توبہ و رجوع کو سزا پر مقدم رکھا جائے؛ کئی حدود میں اقرار سے رجوع کو قبول کرکے سزا ٹال دی جاتی ہے۔ چوتھی حد زمانی و مکانی نظم ہے :نفاذ سرکاری نگرانی میں، مقررہ وقت و طریقے سے ہو، اور اس دوران بھی ملزم کو کھانے پینے و عبادت جیسی انسانی سہولتوں سے محروم نہ کیا جائے۔ یہ حدود اس بات کی گواہی ہیں کہ شریعت میں سزا مقصود بالذات نہیں، بلکہ انصاف و اصلاح کا ایک محتاط ذریعہ ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت میں سزا کے نفاذ کا حق کسی انفرادی شخص یا گروہ کو حاصل نہیں؛ یہ حق صرف ریاست، حکومت اور اس کے مقرر کردہ عدالتی نظام کو حاصل ہے، اور قصاص جیسے معاملے میں بھی ولی کا حق عدالت کے ذریعے ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ حق بہت سی حدود و شرائط سے مقید ہے :جرم کا سخت معیار پر ثابت ہونا، مجرم کا عاقل بالغ و مختار ہونا، شبہ کی موجودگی میں حد کا ساقط ہوجانا، مکمل عدالتی کارروائی، سزا و جرم میں تناسب، قانون کے سامنے سب کی برابری، اور توبہ و اصلاح کو ترجیح۔ ان شرائط کے ساتھ سزا ظلم نہیں رہتی بلکہ کمزوروں کی حفاظت اور معاشرتی امن کا ذریعہ بنتی ہے۔ عصرِ حاضر میں اس اصول کی درست تطبیق یہی ہے کہ جرائم کے فیصلے آزاد عدلیہ قانون کے تحت کرے، کوئی شخص خود قانون ہاتھ میں نہ لے، اور ریاست کے آئین و قانون کی پاسداری کی جائے، کیونکہ نظم و ضبط کی یہی صورت شریعت کے مقصدِ عدل کے مطابق ہے۔

سوال نمبر :3 نکاح کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی اہمیت، ارکان اور شرائط (20 نمبر)

سوال نمبر3 ۔ نکاح کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں نکاح کی اہمیت، ارکان اور شرائط کی تفصیل بیان کریں۔(20)

تعارف

نکاح اسلامی معاشرے کی بنیادی اینٹ اور خاندانی نظام کی بنیاد ہے۔ یہ محض دو افراد کا سماجی معاہدہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی، انبیا کی سنت اور نسلِ انسانی کی بقا و پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ شریعت نے نکاح کو عبادت کا درجہ بھی دیا ہے اور ایک باقاعدہ قانونی عقد کا ڈھانچا بھی فراہم کیا ہے، جس میں فریقین کے حقوق و فرائض واضح طور پر متعین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں نکاح کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے : اس کا مفہوم، اس کا حکم و اہمیت، اس کے ارکان اور اس کی شرائط۔ اس جواب میں پہلے نکاح کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان ہوگا، پھر قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت واضح کی جائے گی، اور اس کے بعد اس کے ارکان، یعنی ایجاب و قبول اور فریقین، اور اس کی شرائط، یعنی اہلیت، ولی، گواہان اور مہر وغیرہ، کی تفصیل عام مذاہب کے منہج کے حوالے کے ساتھ پیش ہوگی، تاکہ طالب علم کو مکمل اور متوازن تصویر مل سکے۔

نکاح کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

لغوی طور پر نکاح عربی لفظ ہے جس کے معنی ملنا، جمع ہونا اور ایک چیز کا دوسری میں شامل ہونا ہیں؛ فقہاء لغت میں اس کے دو استعمال بتاتے ہیں :عقد یعنی معاہدہ، اور اس عقد سے پیدا ہونے والا جائز تعلق۔ اصطلاحی طور پر فقہاء نے نکاح کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ ایک ایسا شرعی عقد ہے جس سے مرد و عورت کے درمیان زوجیت کا حلال تعلق قائم ہوتا ہے اور دونوں کے ایک دوسرے سے شرعی حدود میں استفادہ جائز ہوجاتا ہے۔ فقہِ حنفی کی جامع تعریف کے مطابق نکاح وہ عقد ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ملکِ متعہ یعنی جائز انتفاع پر دلالت کرنے والے الفاظ کے ساتھ کیا جائے۔ تعریف کے اہم اجزا یہ ہیں :یہ عقد ہے، یعنی رضامندی سے ہونے والا معاہدہ؛ یہ شرعی ہے، یعنی اس کی صورتیں و حدود شریعت نے متعین کی ہیں؛ اور اس کا نتیجہ صرف جسمانی تعلق کی اجازت نہیں بلکہ زندگی بھر کے حقوق، یعنی نفقہ، سکونت، حسنِ معاشرت، اولاد کا نسب اور وراثت جیسے قانونی آثار ہیں۔ ان آثار کی موجودگی نکاح کو وقتی تعلقات سے مکمل طور پر ممتاز کردیتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں نکاح کی اہمیت

قرآنِ مجید نے نکاح کو اللہ کی نشانیوں میں شمار کیا ہے :اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کردی۔ اس آیت سے نکاح کے تین مقاصد ظاہر ہوتے ہیں :سکینت یعنی ذہنی و قلبی سکون، مودت یعنی محبت، اور رحمت یعنی ہمدردی و شفقت۔ قرآن نے نکاح کو" میثاقاً غلیظاً "یعنی مضبوط عہد قرار دیا، جو اس معاہدے کی سنجیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے غیر شادی شدہ لوگوں کا نکاح کردینے کی ترغیب دی، غلاموں و لونڈیوں کے نکاح کا حکم دیا، بیوہ و مطلقہ کی عدت کے بعد شادی کی اجازت دی اور پسندیدہ صورت میں تعدد کی مشروط اجازت بھی عدل کی شرط کے ساتھ بیان کی۔ شادی کو پاکدامنی کا ذریعہ قرار دیا گیا اور ایسے لوگوں کو جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں پاکدامن رہنے کا حکم دیا گیا۔ ان تمام احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نکاح کو ایک باقاعدہ سماجی ادارہ بنانا چاہتا ہے جس میں محبت شرعی نظم کے اندر پروان چڑھے۔

سنت کی روشنی میں نکاح کی اہمیت

احادیث میں نکاح کی اہمیت اور زیادہ کھل کر بیان ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے، پس جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ جوانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم میں سے جو استطاعت رکھتا ہو وہ شادی کرے، کیونکہ یہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اور جسے استطاعت نہ ہو وہ روزے رکھے۔ ایک اور حدیث کے مطابق جب بندہ نکاح کرتا ہے تو اس کا آدھا دین مکمل ہوجاتا ہے، پس باقی آدھے میں اللہ سے ڈرے۔ دیندار عورت سے شادی کرنے کی ترغیب، شادی میں آسانی اور سادگی کی تعلیم اور مہر میں حد درجہ سہولت کی پسندیدگی بھی سنت ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ ان ارشادات سے رہبانیت یعنی شادی سے قطعی کنارہ کشی کی بھی نفی ہوتی ہے، کیونکہ کچھ صحابہ نے عبادت کی غرض سے شادی ترک کرنے کا ارادہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ یوں سنت نکاح کو عبادت، اخلاق کی حفاظت اور زندگی کی فطری تکمیل قرار دیتی ہے۔

نکاح کے ارکان

ارکان اس عقد کے وہ بنیادی اجزا ہیں جن کے بغیر نکاح وجود میں ہی نہیں آتا۔ فقہاء کی غالب رائے میں نکاح کے ارکان دو ہیں :صیغہ، اور معقود علیہما یعنی فریقین۔ صیغہ سے مراد ایجاب و قبول ہے :ایجاب ایک فریق، عام طور پر ولی یا عورت کی طرف سے پیشکش ہے، اور قبول دوسرے فریق یعنی شوہر کی طرف سے اس کی منظوری، اور دونوں کا ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے تاکہ آفر اور قبولیت کا تعلق قائم ہو۔ فقہِ حنفی میں ایجاب و قبول کو ایک ہی رکن یعنی صیغہ قرار دیا گیا ہے جب کہ عاقدین کو شرط کے درجے میں رکھا گیا ہے؛ یہ فقہی ترتیب کا فرق ہے جس کا عملی نتیجہ تقریباً یکساں ہے۔ صیغے میں نکاح یا تزویج کے الفاظ یا ان کے معنی رکھنے والے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور مراد صاف ہوتی ہے۔ فریقین یعنی ہونے والے شوہر و بیوی کا تعین بھی لازم ہے ، اس لیے مبہم یا نامعلوم فریق کے ساتھ نکاح درست نہیں۔ نکاح میں نیابت بھی جائز ہے، یعنی وکیل مقرر کرکے یا ولی کے ذریعے عقد کیا جاسکتا ہے، جو آج کے دور میں فاصلاتی صورتوں میں بھی فقہاء کے ہاں اصول فراہم کرتا ہے، البتہ عملی صورت میں رجسٹریشن اور گواہان کی شرعی و قانونی رعایت ضروری رہتی ہے۔

نکاح کی شرائط

شرائط ان باتوں کو کہتے ہیں جن کی موجودگی سے نکاح درست و نافذ ہوتا ہے۔ اہم شرائط درج ذیل ہیں۔ اول اہلیت : فریقین عاقل ہوں، اور نکاح کرنے یا کروانے والا بالغ ہو؛ نابالغ کا نکاح ولی کے ذریعے ہو سکتا ہے مگر اس کے فقہی آثار مذاہب میں مختلف بیان ہوئے ہیں۔ دوم محرمیت کا نہ ہونا :جن عورتوں سے نسب، رضاعت یا مصاہرت کی وجہ سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، ان سے نکاح باطل ہے، جن کی تفصیل سورۃ النساء میں موجود ہے۔ سوم ولی :جمہور کے نزدیک عورت کا نکاح ولی کی اجازت سے ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں؛ فقہِ حنفی میں بالغہ عاقلہ عورت کو خود اپنا نکاح کرنے کا اختیار تسلیم کیا گیا ہے، البتہ کفو یعنی مناسب برابری کی رعایت اور خاندانی رضامندی کو وہاں بھی اہمیت دی گئی ہے۔ طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ عملی زندگی میں خاندانوں کی رضامندی و مشورے کو ترجیح دے کیونکہ نکاح دو خاندانوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ چہارم گواہان :جمہور و حنفیہ کے نزدیک دو عادل مسلمان مردوں، یا ایک مرد و دو عورتوں، کی موجودگی شرط ہے تاکہ اعلانیت قائم ہو اور مستقبل میں

انکار و جھگڑے کی گنجائش نہ رہے۔ پنجم مہر :یہ عورت کا حق ہے جو عقد سے واجب ہوتا ہے؛ اس کی کم از کم مقدار میں مذاہب کا اختلاف ہے، اس لیے مہر باہمی رضا سے باعزت و قابلِ ادا رکھنا چاہیے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ نکاح لغوی طور پر ملنے و جمع ہونے اور اصطلاحی طور پر اس شرعی عقد کا نام ہے جس سے زوجیت کا حلال و باوقار رشتہ حقوق و فرائض سمیت قائم ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے اللہ کی نشانی، سکون، محبت و رحمت کا ذریعہ اور مضبوط عہد قرار دیا، اور سنت نے اسے نبی کی سنت آدھا دین اور پاکدامنی کی حفاظت کہا۔ اس کے ارکان صیغہ یعنی ایجاب و قبول اور معین فریقین ہیں، اور اس کی شرائط میں اہلیت، محرمیت کا فقدان، ولی و گواہان کا مسئلہ، اور مہر شامل ہیں جن کی بعض تفصیلات میں فقہی مذاہب کا معتبر علمی اختلاف موجود ہے۔ نکاح کی یہ شرعی ساخت اسے ایک طرف عبادت بناتی ہے اور دوسری طرف خاندان، اولاد اور معاشرے کے تحفظ کا قانونی نظام۔ جو طالب علم ان ارکان و شرائط کو سمجھ کر شادی کے فیصلے میں اخلاص، آسانی اور خاندانی مشورے کو شامل کرلے وہ اس عظیم نعمت کے مقاصد، یعنی سکون، پاکدامنی اور نسل کی حفاظت، بہتر طور پر پاسکتا ہے۔

سوال نمبر :4 تحفظِ نسل — شریعت نے اس پر کس مقصد کے تحت زور دیا، متعلقہ تعلیمات 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ شریعتِ اسلامیہ نے تحفظِ نسل) نسل کی بقا (پر کس مقصد کے تحت زور دیا ہے؟ اس مقصد کی وضاحت کے ساتھ تحفظِ نسل کے متعلق شریعت کی تعلیمات تحریر کریں۔(20)

تعارف

مقاصدِ شریعہ کی ضروریاتِ خمسہ میں چوتھا مقام تحفظِ نسل کو حاصل ہے۔ نسل کی بقا اور اس کی پاکیزگی و شناخت کی حفاظت انسانی تمدن کی بقا کے مترادف ہے، کیونکہ خاندان، قوم اور پوری انسانیت کا تسلسل اسی سے قائم ہے۔ شریعت نے اس ایک مقصد کے گرد احکام کا پورا نظام بنایا ہے :نکاح کی ترغیب و تنظیم، زنا کی حرمت و سزا، قذف کی

سزا، عدت کے احکام، نسب کا اثبات، رضاعت کے قواعد اور اولاد کی تربیت۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں :پہلا یہ کہ شریعت نے تحفظِ نسل پر کس مقصد کے تحت زور دیا، اور دوسرا اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ اس جواب میں پہلے مقصد کی وضاحت کی جائے گی، یعنی نسل کی بقا کے ساتھ ساتھ نسب کی صفائی، بچے کے حقوق، خاندان کا استحکام اور معاشرتی امن؛ پھر ان مقاصد کو حاصل کرنے والی شرعی تعلیمات مثبت و منفی دونوں پہلوؤں سے ترتیب وار بیان کی جائیں گی، اور آخر میں عصری معنویت کا جائزہ لیا جائے گا۔

تحفظِ نسل کا مقصد :بقا، شناخت اور استحکام

تحفظِ نسل کا پہلا مقصد نوعِ انسانی کی بقا ہے۔ اگر نسل کا سلسلہ جائز و منظم ذریعے سے نہ چلے تو یا تو آبادی کا خاتمہ ہوگا یا بے راہ روی پھیلے گی، دونوں صورتیں تمدن کے لیے تباہ کن ہیں۔ اسی لیے قرآن نے جوڑوں کی پیدائش کو اللہ کی نشانی، اور اولاد کو زندگی کی زینت اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کی ترغیب دی تاکہ امت کی کثرت ہو۔ دوسرا مقصد نسب کی شناخت و صفائی ہے :ہر بچے کو یہ حق حاصل ہو کہ اسے اپنے والدین، خاندان اور وراثت کی واضح شناخت ملے۔ نسب ہی سے نفقہ، پرورش، ولایت اور میراث کے حقوق جڑتے ہیں؛ اگر نسب مشتبہ ہوجائے تو بچہ بے سہارا اور معاشرہ جھگڑوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ تیسرا مقصد خاندان کا استحکام ہے، کیونکہ منظم خاندان ہی بچے کی جسمانی نشو و نما، اخلاقی تربیت اور جذباتی سلامتی کی بہترین جگہ ہے۔ چوتھا مقصد معاشرے کی عفت و پاکیزگی ہے، کیونکہ جب جائز راستہ آسان اور ناجائز راستہ بند ہو تو اخلاقی بیماریاں، خاندانی تنازعات اور نسلی امراض کا سدباب ہوتا ہے۔ یوں تحفظِ نسل چار جہتی مقصد ہے :بقا، نسب، خاندان اور عفت۔

مثبت تعلیمات :نکاح اور خاندانی نظام

شریعت کی پہلی مثبت تعلیم نکاح کو عام و آسان کرنا ہے۔ قرآن نے غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کردینے کا حکم دیا اور پاکدامن زندگی کی ضمانت کے طور پر نکاح کو پیش کیا، اور سنت نے مہر و ولیمے میں سادگی کی ترغیب دی تاکہ مالی رکاوٹیں شادی میں تاخیر کا سبب نہ بنیں۔ دوسری تعلیم نکاح کی شرعی تنظیم ہے جس کی تفصیل ارکان و شرائط میں گزری :ولی، گواہان، اعلانیت اور مہر۔ خاص طور پر اعلانِ نکاح پر زور اس لیے ہے کہ خفیہ تعلقات نسب و حقوق کی

تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ تیسری تعلیم عدت کے احکام ہیں :طلاق یا وفات کے بعد عورت کے لیے عدت مقرر کی گئی جس کی واضح حکمت رحم کے خالی ہونے کا یقین اور اولاد کے نسب کا تحفظ ہے، ساتھ ہی رجوع یا نئی زندگی کی سوچ بچار کا موقع بھی۔ چوتھی تعلیم نسب کے اثبات کے اصول ہیں، مثلاً بچے کو اس کے خاندان میں شمار کرنا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، لعان کا طریقہ کار، اور رضاعت کے احکام جن سے دودھ کے رشتے بھی نسب جیسی حرمت پیدا کرتے ہیں۔ پانچویں تعلیم اولاد کے حقوق ہیں :اچھا نام رکھنا، عقیقہ، رضاعت و پرورش، تعلیم و تربیت اور اولاد کے درمیان عدل۔ یہ ساری تعلیمات بتاتی ہیں کہ شریعت نسل کو صرف پیدا نہیں کرنا چاہتی بلکہ ہر بچے کو شناخت، سہارا اور تربیت کے ساتھ پروان چڑھانا چاہتی ہے۔

منفی تعلیمات :زنا و قذف کی ممانعت و سزا

تحفظِ نسل کا منفی پہلو ان تمام راستوں کی بندش ہے جو نسل و نسب کو بگاڑتے ہیں۔ سب سے بڑی ممانعت زنا کی ہے : قرآن نے زنا کے قریب جانے سے بھی منع کیا اور اسے بے حیائی و برا راستہ قرار دیا، کیونکہ زنا سے نسب خلط ہوتا ہے، خاندان ٹوٹتے ہیں، بچے بے شناخت رہ جاتے ہیں اور معاشرے میں بے اعتمادی پھیلتی ہے۔ اسی لیے اس پر حد بھی مقرر ہوئی، مگر اس کے ثبوت کی شرائط اتنی سخت رکھی گئیں، یعنی چار عادل گواہ یا آزادانہ اقرار، کہ اس کا عملی اطلاق تقریباً روک تھام و عبرت کے دائرے تک محدود رہا، اور اسے عدالت کے سوا کوئی نافذ نہیں کرسکتا۔ زنا کی تہمت یعنی قذف پر بھی اسی مقصد کے تحت حد مقرر ہوئی :پاکدامن عورت یا مرد پر بغیر گواہوں کے الزام لگانا نسب و عزت دونوں کو مجروح کرتا ہے، اس لیے تہمت لگانے والے کو سزا دے کر آبروؤں کی حفاظت کی گئی۔ اسی طرح وہ تمام ذرائع جو زنا کی طرف لے جائیں، یعنی بے پردگی کا ماحول، فحش مواد اور غیر محرم سے بے تکلف اختلاط، سد ذرائع کے اصول کے تحت روکے گئے، اور نگاہ و شرم گاہ کی حفاظت کو ایمانی تقاضا قرار دیا گیا۔

مزید تعلیمات :اولاد کی بقا اور خاندان کی حفاظت

تحفظِ نسل کے ذیل میں چند مزید تعلیمات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک، خشیتِ افلاس سے اولاد کے قتل کی ممانعت :قرآن نے غربت کے خوف سے اولاد کو قتل کرنے سے سختی سے روکا اور فرمایا کہ رزق اللہ دیتا ہے؛ زمانۂ جاہلیت کی اس رسم کا خاتمہ نسل کی بقا کی تاریخی مثال ہے۔ دو، متبنّی یعنی لے پالک کے مسائل میں نسب کی حفاظت :اسلام نے کفالت و

پرورش کی پوری اجازت بلکہ ترغیب دی مگر بچے کو اس کے اصل والد کی طرف منسوب رکھنے کا حکم دیا تاکہ شناخت و وراثت کا نظام محفوظ رہے؛ کفالت الگ اعزاز ہے اور نسب کی تبدیلی الگ معاملہ۔ تین، حمل و رضاعت کے احکام :ماں کی صحت، بچے کی رضاعت کی مدت اور اس دوران والد کی ذمہ داریوں کو بیان کرکے نومولود کے حقوق محفوظ کیے گئے۔ چار، طلاق کے باوجود بچوں کی حضانت یعنی پرورش کے احکام ماں، باپ اور خاندان کے درمیان اس ترتیب سے رکھے گئے ہیں کہ بچے کی مصلحت مقدم رہے۔ پانچ، شادی میں تاخیر پیدا کرنے والی رسموں، مہنگے جہیز اور دکھاوے کی حوصلہ شکنی بھی اسی مقصد کی خدمت ہے کیونکہ یہ چیزیں عملاً نسل و خاندان کے قیام میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

عصری معنویت اور نتیجہ

آج کے دور میں تحفظِ نسل کی اہمیت نئے پہلوؤں سے اجاگر ہوئی ہے۔ خاندانی نظام کی کمزوری، شادی میں تاخیر، بچوں کی شناخت و کاغذات کے مسائل، گمشدہ و یتیم بچوں کی کفالت اور میڈیا کی بے راہ روی نے اسی پرانے مقصد کو نیا تناظر دیا ہے۔ شرعی تعلیمات کی روشنی میں اس کا حل یہی بنتا ہے کہ نکاح آسان و عام کیا جائے، خاندانوں کو جوڑنے میں تعاون ہو، بچوں کی پیدائش کی رجسٹریشن و شناخت محفوظ رکھی جائے، یتیموں و بے سہارا بچوں کی کفالت کو سماجی فریضہ سمجھا جائے، اور نسلی پاکیزگی کے لیے اخلاقی تعلیم و میڈیا کی ذمہ داری اجاگر کی جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شریعت نے تحفظِ نسل پر چار جہتی مقصد کے تحت زور دیا ہے :نوعِ انسانی کی بقا، نسب کی شناخت و صفائی، خاندان کا استحکام اور معاشرے کی عفت۔ اس کے لیے ایک طرف نکاح، عدت، اثباتِ نسب اور حقوقِ اولاد جیسی مثبت تعلیمات دی گئیں اور دوسری طرف زنا و قذف کی ممانعت و سزا، ذرائع کی بندش اور اولاد کے قتل کی حرمت جیسی منفی تدابیر اختیار کی گئیں۔ یہ دو طرفہ نظام ثابت کرتا ہے کہ مقاصدِ شریعہ میں نسل کی حفاظت محض آبادی بڑھانا نہیں بلکہ ہر انسان کو باعزت شناخت، محفوظ خاندان اور پاکیزہ ماحول فراہم کرنا ہے۔

سوال نمبر :5 ارتداد کی شناخت کے عوامل، ارتداد و کفر کی تعریف اور ان میں فرق (20 نمبر)

سوال نمبر5 ۔ ارتداد کی شناخت میں کن کون سے عوامل مؤثر ہوتے ہیں؟ ارتداد اور کفر کی تعریف اور ان میں فرق واضح کریں۔(20)

تعارف

ارتداد اور کفر دو قریبی اصطلاحات ہیں جنہیں اکثر ایک ہی معنی میں استعمال کرلیا جاتا ہے، حالانکہ فقہ و عقائد کی کتابوں میں ان کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں یہ بتانا ہے کہ کسی شخص کے قول یا فعل کو ارتداد قرار دینے کی شناخت میں کون سے عوامل مؤثر ہوتے ہیں، یعنی وہ شرائط و علامات جن کو دیکھے بغیر ایسا سنگین حکم نہیں لگایا جاسکتا؛ اور دوسرے حصے میں ارتداد و کفر کی تعریفیں بیان کرکے ان کا فرق واضح کرنا ہے۔ یہ موضوع انتہائی حساس ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی مسلمان کے ایمان کے فیصلے سے ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں سخت تنبیہ فرمائی ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو کافر کہے تو ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف وہ بات لوٹتی ہے۔ اس لیے اس جواب میں علماء کے بیان کردہ اصول و احتیاطوں کو مرکز میں رکھا جائے گا، تاکہ طالب علم شناخت کے عوامل اور فرق کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ تکفیر میں عجلت سے بچنے کا ادب بھی سیکھے۔

کفر کی تعریف

کفر کے لغوی معنی چھپانا اور ڈھانپنا ہیں؛ اسی لیے کسان کو بھی عربی میں کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپاتا ہے، اور نعمت کی ناشکری کو بھی کفران کہا گیا ہے کیونکہ ناشکرا نعمت کو چھپاتا ہے۔ اصطلاح میں کفر ایمان کی ضد ہے، یعنی ان چیزوں میں سے کسی کا انکار کرنا جن پر ایمان لانا ضروری ہے :اللہ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان کے ارکان مشہور ہیں، اور دین کی ان قطعی و ضروری معلومات کا انکار بھی کفر شمار ہوتا ہے جن کا ثبوت یقینی ہو۔ علماء نے کفر کی جو قسمیں بیان کی ہیں ان میں کفرِ انکار، کفرِ جحود یعنی جان

بوجھ کر حق چھپانا، کفرِ عناد یعنی ضد کی بنا پر نہ ماننا، کفرِ استکبار اور کفرِ نفاق شامل ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر بڑا گناہ کفر نہیں ہوتا؛ اہلِ سنت کے نزدیک گناہِ کبیرہ کا مرتکب، جب تک وہ اسے حلال نہ سمجھے، کافر نہیں ہوتا بلکہ فاسق مسلمان رہتا ہے۔ فرقوں کی تاریخ میں خوارج نے اسی نکتے پر غلطی کی تھی، اس لیے تعریف کے ساتھ یہ احتیاط بھی اس باب کا حصہ ہے۔

ارتداد کی تعریف اور اس کا دائرہ

ارتداد کی تعریف پہلے سوال میں تفصیل سے گزر چکی ہے کہ یہ اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے واپس لوٹنے کا نام ہے۔ مختصراً اصطلاح میں وہ شخص مرتد کہلاتا ہے جو اسلام پر ثابت رہنے کے بعد عاقل، بالغ اور مختار ہونے کی حالت میں اس سے خارج ہوجائے، خواہ خروج صریح قول سے ہو، فعل سے ہو یا قطعی منکر عقیدے سے۔ ارتداد کی تعریف میں" اسلام کے بعد "کی قید ہی اسے عام کفر سے جدا کرتی ہے۔ نیز یہ نکتہ اہم ہے کہ ارتداد ایک فقہی و قانونی حکم بھی ہے جس کا اطلاق باقاعدہ اہلِ علم و عدالت کا کام ہے، جب کہ عام گفتگو میں کسی پر اس لفظ کا اطلاق نہایت خطرناک ہے۔ تاریخ میں ارتداد کے واقعات عموماً اجتماعی و سیاسی پس منظر رکھتے تھے، جیسے عہدِ صدیقی میں مانعینِ زکاۃ و مدعیانِ نبوت کے فتنے، جن کا مقابلہ ریاست نے نظم و امن اور دین کی حفاظت کے تحت کیا۔ انفرادی سطح پر شبہات کا علاج علماء و مشائخ کے ذریعے دعوت و حکمت سے کیا جاتا رہا ہے، اور یہی طریقہ سنت سے ثابت اور آج بھی کارگر ہے۔

ارتداد کی شناخت میں مؤثر عوامل) حصہ اول(

کسی صورت کو ارتداد قرار دینے میں فقہاء نے درج ذیل عوامل کو مؤثر قرار دیا ہے۔ پہلا عامل سابقہ اسلام کا ثبوت ہے : جب تک کسی کا مسلمان ہونا یقینی نہ ہو اس پر ارتداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا عامل اہلیت ہے :قول و فعل کا صادر کرنے والا عاقل و بالغ ہو؛ بچے اور مجنون کا کلام شرعی اعتبار سے مؤثر نہیں۔ تیسرا عامل اختیار و قصد ہے : جس شخص کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہلوایا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، وہ قرآن کی صراحت کے مطابق مرتد نہیں ہوتا؛ اسی طرح نیند، غصے کی شدت میں بے قابو کلام، اور زبان کی لغزش کو قصد پر محمول نہیں کیا جاتا۔ چوتھا عامل صراحت و قطعیت ہے :قول یا فعل واضح طور پر کفر پر دلالت کرتا ہو؛ اگر کلام میں تاویل کی گنجائش ہو، استعارات ہوں یا مجاز کا احتمال ہو تو حکم نہیں لگایا جاتا۔ مشہور اصولی مثال یہ ہے کہ کلام کو جہاں

تک ممکن ہو درست مفہوم پر محمول کیا جائے گا۔ پانچواں عامل علم و جہل ہے :جو شخص نومسلم ہو یا ایسی ماحول میں پلا ہو جہاں دین کی ضروری معلومات اس تک نہ پہنچی ہوں، اس کے کسی انکار کو اس وقت تک ارتداد نہیں کہا جاتا جب تک اس پر حجت قائم نہ کردی جائے اور غلط فہمی دور نہ کی جائے۔

ارتداد کی شناخت میں مؤثر عوامل) حصہ دوم(

چھٹا عامل تاویل و اجتہاد ہے :جو شخص کسی امر کی تاویل یا اجتہادی فہم کی بنیاد پر کوئی بات کہے، خواہ وہ فہم غلط ہی کیوں نہ ہو، اسے فقہاء کی غالب رائے میں مرتد قرار نہیں دیا جاتا، ورنہ ہر فقہی و کلامی اختلاف تکفیر کا دروازہ کھول دے۔ ساتواں عامل عمل کی نوعیت ہے :بعض اعمال فی نفسہٖ کفر پر دلالت کرتے ہیں، جیسے صریح استہزا یا بت پرستی کا قصدِ عبادت کے ساتھ ارتکاب، جب کہ کئی افعال علامت کے درجے میں ہوتے ہیں جن میں نیت و قرائن کی تحقیق ناگزیر ہے۔ آٹھواں عامل ثبوت و گواہی ہے :ارتداد کے دعوے کو عدالت میں معتبر گواہی و دلیل سے ثابت کرنا پڑتا ہے اور مدعا علیہ کو جواب کا پورا موقع ملتا ہے۔ نواں عامل شبہات کا ازالہ و حجت کا قیام ہے :یہی وہ عمل ہے جسے فقہاء استتابہ کی صورت میں بھی بیان کرتے ہیں، یعنی شخص کے شبہات سنے جائیں، دلائل پیش کیے جائیں اور واپسی کا موقع دیا جائے۔ دسواں عامل فیصلہ کرنے والے کی اہلیت ہے :ارتداد کا فیصلہ مستند عالم و باقاعدہ عدالت ہی کا حق ہے؛ نااہل افراد یا جذباتی ہجوم کا فیصلہ شرعاً قابلِ اعتبار نہیں۔ ان تمام عوامل کا مجموعہ بتاتا ہے کہ شناخت کا عمل فیصلہ سنانے سے زیادہ تحقیق و احتیاط کا عمل ہے۔

جدول :کفر اور ارتداد میں بنیادی فرق

پہلو	کفر	ارتداد
ابتدائی حالت	اصل حالت بھی ہوسکتی ہے، یعنی شخص کبھی مسلمان نہ ہوا ہو	لازمی ہے کہ شخص پہلے مسلمان ہو
مفہوم کی وسعت	وسیع و عام اصطلاح، ایمان کی ہر ضد کو شامل	خاص اصطلاح، اسلام سے خروج کے لیے مخصوص

استتابہ، توبہ کی دعوت اور مخصوص فقہی احکام سے متعلق باب	غیر مسلم شہریوں، ذمی و معاہد وغیرہ کے الگ احکام ہیں	فقہی احکام
سابقہ اقرار کے بعد انکار، اس لیے الگ باب میں زیرِ بحث	ایمان کا انکار بذاتِ خود موضوع ہے	مواخذے کا محور

ارتداد اور کفر میں فرق

اب فرق کو منظم صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ پہلا فرق دائرے کا ہے :کفر عام اصطلاح ہے جو ہر اس انکار کو شامل ہے جو ایمان کے منافی ہو، خواہ انکار کرنے والا کبھی مسلمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو؛ ارتداد خاص ہے، یعنی صرف اس کفر کو کہتے ہیں جو اسلام کے بعد پیش آئے۔ دوسرا فرق موضوع کا ہے :کفر کا تعلق براہ راست عقیدے و انکار سے ہے، جب کہ ارتداد میں سابقہ اقرار و بیعت سے رجوع کا عنصر شامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے فقہاء نے اس کے احکام الگ باب میں لکھے ہیں۔ تیسرا فرق احکام کا ہے :اصل کافر، یعنی غیر مسلم، کے لیے اسلام میں شہری حقوق، ذمہ و معاہدے اور امن کے احکام موجود ہیں اور اسے دعوت دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے؛ مرتد کے باب میں فقہاء نے استتابہ و توبہ کی دعوت اور قدیم قانونی نظام میں کچھ مخصوص احکام بیان کیے ہیں جن کی تفصیل ان کے سیاق کے ساتھ سمجھی جاتی ہے۔ چوتھا فرق عملی موقف کا ہے :کسی غیر مسلم کو کافر کہنا اس کے معروف مذہبی وصف کا بیان ہے جس میں بداخلاقی کی اجازت پھر بھی نہیں، جب کہ کسی مسلمان کو کافر یا مرتد کہنا ایک سنگین الزام و فیصلہ ہے جس کی شرعی و اخلاقی ذمہ داری کہنے والے پر آتی ہے۔ ان فروق کو سمجھ لینے سے اصطلاحات کی غلط العام استعمال رکتی ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ کفر ایمان کی ضد کا عام نام ہے یعنی ضروریاتِ ایمان میں سے کسی کا انکار، جب کہ ارتداد اسلام کے بعد اس سے رجوع کا خاص نام ہے، اور دونوں میں دائرے، موضوع اور فقہی احکام کے اعتبار سے واضح فرق موجود ہے۔ کسی صورت کو ارتداد قرار دینے کی شناخت میں سابقہ اسلام، اہلیت، اختیار و قصد، صراحت و قطعیت، علم و حجت کا قیام، تاویل کی گنجائش، ثبوت کی مضبوطی اور فیصلہ ساز کی اہلیت جیسے عوامل مؤثر ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی

عامل کے کمزور ہونے سے حکم رک جاتا ہے۔ یہی احتیاط دین کا مزاج ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی حرمت کو کعبے کی حرمت سے بڑھ کر قرار دیا ہے۔ طالب علم کے لیے اس باب کا اصل سبق علم کے ساتھ ادب و احتیاط ہے :اصطلاحات کو درست استعمال کرے، اختلافات کو علماء کے سپرد کرے، شبہ میں پڑے لوگوں کی رہنمائی حکمت و نرمی سے کرے، اور کسی فرد کے ایمان پر فیصلہ صادر کرنے سے ہمیشہ گریز کرے، کیونکہ دلوں کا اصل فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com